شاہراہِ مکّہ

(آخری قسط)

مغربی تہذیب سے انسانیت کو جو عظیم نقصانات پہنچے ہیں، ان میں ایک نقصان خاندانی نظام کی بربادی بھی ہے۔ اس نظام کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے اب نہ تو والدین کو اپنی اولاد سے محبت رہی ہے اور نہ ہی اولاد کو اپنے ماں باپ اور دوسرے اعزہ سے کوئی اُنس باقی رہا ہے۔ چونکہ اب زندگی کے ہر معاملہ کو جیب اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے اس لیے زندگی کے وہ سارے تعلقات اور روابط جن کی بنیاد محبت، مودّت اور ایثار پر ہے، وہ قریب قریب ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب عزت و توقیر اسی شخص کی ہے جو مادّی اعتبار سے زیادہ خوشحال ہے۔ باپ اگر کماتا ہے تو وہ تعظیم کے لائق ہے لیکن اگر وہ کمانا چھوڑ دیتا ہے تو پھر وہ ایک بوجھ ہے اور یہ جتنی جلدی ہلکا ہو، اولاد کے حق میں اتنا ہی بہتر ہے۔ وہ اولاد جو والدین کو بار محسوس کرے، اس کا جو تعلق اپنے بزرگوں سے ہوگا اس کا ہر شخص خود ہی اندازہ کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس جس تہذیب نے اپنی رفیع الشان عمارت مادّی بنیادوں پر نہیں بلکہ خالص روحانی بنیادوں پر تعمیر کی ہے۔ اس میں باہمی تعلقات کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ یہاں کسی شخص کا عزت و احترام اس وجہ سے نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ مادّی لحاظ سے ہمارے لیے فائدہ مند ہے بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس سے ہمارا جذباتی اور روحانی رشتہ کس قسم کا ہے، اور اس سے ہماری روح کو کس طرح بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس تعلق کو احسان پر استوار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں جہاں اس حقیقت پر تنبیہ کی ہے اس کو بڑی اہمیت دی ہے

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ — یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا — کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ عزیزو

وَذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ (البقرہ - ۱۰)

اقارب کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور لوگوں سے بھلی بات کہنا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔ (النساء - ۲)

اور تم سب اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسایہ سے، ہم نشین دوست سے، اور مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں، احسان کرو۔ یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ کِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا (بنی اسرائیل - ۲)

تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں، بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو۔ بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری بے شمار آیات اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں کہ ایک مسلمان کا اپنے والدین اور دوسرے اقرباء سے تعلق خالص روحانی نوعیت کا ہے۔ اس کی تہ میں کوئی مادی حرص یا کوئی معاشی نفع کارفرما نہیں بلکہ اس میں جذبہ اور خلوص بطور اساس کے کام دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان آیات میں جو دوسری چیز قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں والدین کی خدمت اُن کی عزت و توقیر اور خویش و اقارب سے حسنِ سلوک اتنی بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کا جب بھی ذکر کیا گیا ہے وہ شرک سے مخالفت کے بعد شروع ہوا ہے یعنی انسان اور خدا کے تعلقات میں سب سے

زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرے، اُس کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور پھر انسان اور انسان کے تعلق میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ ایک شخص اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے، خصوصاً اُن حالات میں جب کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہوں اور کچھ کمانے کے قابل نہ ہوں۔ بڑھاپا زندگی کا وہ دور ہے جس میں ایک شخص عام طور پر دوسروں کے لیے بوجھ بنتا ہے، جس میں اُس کی طبیعت میں بچوں کی سی عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگتا ہے، ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتا ہے۔ اُس کی قوتِ برداشت کم ہو جاتی ہے اور طبیعت پر غصہ غالب رہتا ہے یہی وہ زمانہ ہے جس میں وہ دوسروں کے حسنِ سلوک کا نسبتاً زیادہ محتاج ہوتا ہے اس لیے قرآنِ حکیم نے اس عہد کے لیے خصوصاً تاکید فرمائی ہے۔

ایک مغربی تہذیب میں سرشار انسان کے لیے یہ چیز بڑی حیرت انگیز ہے کہ کوئی شخص اپنے "ناکارہ" اور "غیر مفید" والدین کی خدمت کرے، اور اپنی ضروریات کو قربان کر کے، اپنے عزیز و اقارب کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرے۔ مغرب کا اندازِ فکر تو انسان کی رہنمائی اُس طریق پر کرتا ہے جس سے سماج کو زیادہ سے زیادہ مادی نفع حاصل ہو۔ اولاد اور والدین کے پاکیزہ تعلقات اہلِ مغرب کے نزدیک محض اعتباری باتیں ہیں اور یہ سب "دورِ جاہلیت" کی یادگار ہیں۔ اب جدید روشنی میں انسان کو نہایت ہی "حقیقت پسندانہ" انداز پر سوچنا چاہیے۔ انسان کی حیثیت ایک جانور کی سی ہے۔ وہ جب چارہ کم کھائے اور کما کر زیادہ لائے تو اُسے اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل ہے اور ہمارے لیے بھی اُس کے بقا کے لیے فکرمند ہونا اشد ضروری ہے لیکن جب اُس کے چارے کا پلڑا، اُس کی آمدنی کے مقابلے میں جھک جائے تو پھر سماجی "فلاح و بہبود" کے لیے ناگزیر ہے کہ اُسے "قصاب" کے حوالے کر دیا جائے جو اس مہذب سوسائٹی کو اس ناگوار بوجھ سے نجات دلا دے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں ایک طبقہ اسی طرز پر سوچنے لگا ہے۔ بوڑھے والدین کی زندگیاں اتنی تلخ کر دی گئیں کہ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں زندگی کی ٹمٹماتی شمع کو گل کر دیا۔ بعض "روشن خیال فرزندوں" نے بھی اس جوئے کو اتار پھینکنے کے لیے اسکیمیں بنانا شروع کیں۔ اور علانیہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا جانے لگا۔ مگر بوڑھے والدین کو

نہایت آرام و سکون کے ساتھ موت کی نیند سلا دیا جائے تو آخر اس میں کیا حرج ہے۔ اس طرح ایک طرف تو بوڑھے لوگ بڑھاپے کے عذاب اور تکلیفات سے بچ جائیں گے اور دوسری طرف سوسائٹی پر سے یہ ناجائز بوجھ اتر جائے گا۔ بوڑھے آدمیوں میں سے بعض نے حالات کے یہ تیور دیکھ کر خود ہی اپنے آپ کو سماج کے قدموں میں ڈال دیا۔ کسی نے کہا میری نعش کو مرنے کے بعد ہسپتال کو دے دینا، کسی نے اسے جانوروں کو کھلا دینے کی وصیت کی۔ الغرض اس معاملہ پر بڑی سنجیدگی سے غور ہونے لگا۔ ان میں سے بعض لوگ جو زیادہ جدید اور روشن خیال تھے انہوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور کہا کہ جس طرح جانوروں کی ہڈیاں اور اُن کا خون کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، کیوں نہ انسان کے جسم کو بھی اس کام میں لایا جائے۔ جو شخص ساری عمر سماج کے لیے زندہ رہا ہے اسے مرنے کے بعد بھی سماج ہی کی خدمت کرنی چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرز فکر کو زیادہ قبول عام نہیں ہوا۔ یہ بات منطقی حد تک تو درست ہے اور مادی تہذیب کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ لیکن اس معاملہ میں جذبات نے اس نظریہ کو پروان نہ چڑھنے دیا اور وہ اس کی ترقی میں رکاوٹ کا باعث بنے۔

اسد صاحب، جنہوں نے مغربی تہذیب و تمدن کی آغوش میں پرورش پائی ہے، انہیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ایک بادشاہ، جس کی عمر پچاس کے قریب ہے، اور جس نے خود اپنی محنت اور ذہانت سے سلطنت حاصل کی ہو وہ باپ کا اس قدر تابع فرمان ہو کہ وہ اس بالائی منزل پر بیٹھنا تک پسند نہ کرے جس کے نیچے اُس کا باپ رہتا ہے۔ اپنے اس استعجاب کو انھوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

"شاہ ابن سعود اپنے باپ سے اس قدر زیادہ محبت کرتے تھے جس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ اُن کے والد عبدالرحمٰن اگرچہ ایک پرہیزگار اور شفیق انسان تھے، لیکن اپنے بیٹے کی طرح کسی نمایاں خصوصیت کے حامل نہ تھے۔ اس دور کے بعد بھی جبکہ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ سلطنت حاصل کی تھی، وہ اپنے باپ سے یہاں تک ادب سے پیش آتے کہ جب

عبدالرحمن، اُن کے والد، کسی کمرے میں ہوتے تو وہ اُس کی چھت پر قدم تک رکھنا گوارا نہ کرتے۔ اور کہتے کہ میں اپنے والد محترم کے سر پہ چلنے کی کس طرح جرأت کر سکتا ہوں۔ مجھے ان کی باپ کے سامنے اسی انکساری نے ایک مرتبہ ایک عجیب و غریب مخمصے میں ڈال دیا۔ میں ایک دن حسب معمول بادشاہ کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم دونوں فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ شیخ تشریف لا رہے ہیں۔ کچھ لمحات کے بعد بادشاہ دروازہ پر آپہنچا۔ میں نے تعظیم کی غرض سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن عبدالرحمن نے مجھے کلائی سے پکڑ کر بٹھا دیا اور کہا آپ میرے مہمان ہیں۔ میں اس بات سے سخت پریشان ہوا کہ بادشاہ تو اجازت کے انتظار میں باہر کھڑے رہیں اور میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہوں۔ اس اثنا میں عبدالرحمن نے اپنی گفتگو اس اطمینان سے جاری رکھی جیسے کہ کوئی دخل اندازی نہیں ہوئی۔ چند منٹوں کے بعد بادشاہ کے والد نے سر اٹھایا اور کہا "اے لڑکے نزدیک آکر بیٹھ جاؤ۔ اس وقت بادشاہ کی عمر سینتالیس سال کی تھی"۔

اس باب میں فاضل مصنف نے ایک بڑی فکر انگیز بحث یہ بھی چھیڑی ہے کہ ہم کسی شخص کو جب پہلے پہل اپنے آگے لگاتے ہیں تو اس مفروضہ پر اُس کی پیروی کرنا شروع کرتے ہیں کہ وہ شخص منزہ عن الخطا ہے، دنیا کے ہر عیب سے خالی ہے اور دنیا کی ہر صفت سے متصف ہے۔ لیکن جب اس میں ذرا سی خامی بھی دیکھ پاتے ہیں تو پھر اس کے خلاف جدوجہد کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں، اور اس وقت تک چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے جب تک کہ اُس کے سب کیے کرائے پر پانی نہ پھیر دیا جائے۔ ہماری یہ کیفیت انتہائی افسوسناک ہے۔ ہم میں اعتدال نہیں۔ ہمارے فیصلے حقیقت پسندی پر مبنی نہیں ہوتے۔ اس معاملہ میں ہم ہمیشہ سے انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہماری عقیدت و نفرت دونوں ہی اندھی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری کوئی تحریک بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک افضل و اکمل اگر کوئی ذات ہے تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ ہر خطا سے پاک اور کمزوری سے منزہ ہیں۔ وہی ہمارے سامنے اصل معیار ہیں، وہی ہمارے لیے ایک آئیڈیل ہیں۔ ہر دوسرا شخص جو کچھ بھی کہے یا کرے، اسے ہمیں اسی ایک معیار کے مطابق جانچنا اور پرکھنا چاہیے اور اس نسبت

سے وہ جس مرتبہ میں ہو، اسے اسی مرتبہ اور مقام پر رکھنا چاہیے لیکن تاریخ کے ہر دور میں ہم نے اس بڑی حقیقت کو جو ہمارے ایمان کا ایک ضروری جزو ہے، بھلا دینے کی حماقت کی ہے اور اسی وجہ سے ہم مختلف قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ قریب قریب یہی سلوک اہلِ نجد نے شاہ ابن سعود سے کیا۔ اس نے جب شریف حسین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو لوگوں نے اُسے انسانیت کا واحد نجات دہندہ خیال کیا۔ لیکن جب اُس نے سلطنت حاصل کر چکنے کے بعد عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنا شروع کی تو پھر اُسے فرعون کا لقب دیا گیا۔ اُس کے متعلق جس طرح پہلی رائے مبالغہ آمیز ہے اُسی طرح دوسری میں بھی غلو اور شدّت ہے۔

مسلمانوں کی قومی تاریخ میں کتنی شخصیتیں اُبھریں، انہوں نے عوام کے قلوب کو مسخّر کر کے بڑی بڑی زوردار تحریکیں چلائیں لیکن جلد ہی وہ ختم بھی ہوگئیں۔ جس مبالغہ آمیزانہ عقیدت نے انہیں جنم دیا۔ وہی پھر اُن کی مدفن بھی بنی۔ جس طرح کسی فرد یا تحریک میں ذراسی خوبی ہمیں فوراً اس پر فریفتہ کر دیتی ہے اور ہم دل و جان سے اس پر فدا ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، بالکل اسی طرح اُس میں ذراسی لغزش یا کمزوری بھی ہمیں نفرت کی آخری انتہا تک لے جاتی ہے۔ اس اندازِ فکر سے ہماری ملت کو بے حد صدمہ پہنچا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے ہم نے تحریکِ اسلامی کو ہمیشہ شعوری یا غیر شعوری طور پر افراد سے وابستہ کیا ہے۔ کسی تحریک کے اٹھانے اور اُسے لے کر آگے بڑھنے میں اشخاص کا بلاشبہ بڑا دخل ہے لیکن وہ تحریکات جو اصولوں پر قائم ہوتی ہیں، ان میں اشخاص خواہ کتنی بڑی اہمیت کے حامل ہوں بہر حال ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں اصولوں پر کبھی بھی برتری اور تفوق نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اسے اس قوم کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اصولوں سے محبت کی بجائے ہمیشہ افراد کو اپنا محورِ عقیدت بنایا ہے۔ اور اس میں اتنی زیادتی کی کہ اصولوں کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ اشخاص کی بھینٹ چڑھا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کے

دھارے میں اگرچہ تسلسل اور روانی تو موجود ہے لیکن اس کی موجوں میں وہ یکسانیت دکھائی نہیں دیتی جس کا اس کی نزاکت تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ہاں جب بھی کوئی تحریک احیائے اسلام کے لیے اٹھی تو وہ چند افراد کی ہرلعزیزی پر اٹھی، لوگوں کو بھی محبت تحریک سے کہیں زیادہ افراد سے پیدا ہوئی اور جب ان افراد میں کوئی کمزوری دکھائی دی تو فوراً دل شکستہ ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ طرزِ عمل اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ ان حضرات کا تعلق صرف چند افراد سے تھا، اور انہیں کی وجہ سے وہ تحریک سے وابستہ تھے۔

مسلم قوم کی اس ذہنی کیفیت کو اسد صاحب نے ایک دوست کی زبان سے بڑی عمدگی سے ادا کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ابن سعود نے اُن بہت سی توقعات کو جو جوانی میں اس سے وابستہ کی جاتی تھیں، اپنے طرزِ عمل سے غلط ثابت کیا ہے۔۔۔ لوگ کس طرح آسانی کے ساتھ اُس نا امیدی کو برداشت کر سکتے ہیں، جو انہیں اس سے ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ نجد کے اب بہت سے نوجوان شاہ کے خلاف نہایت تلخ باتیں کہتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ نے اُن کے اعتماد کو نقصان پہنچایا ہے۔ میں اپنے ایک نجدی دوست کے یاس قنوطیت کے اُن جذبات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو کبھی ابن سعود کی قیادت کا پرجوش حامی تھا اور جس نے زندگی کے تاریک ترین لمحات میں اُس کا ساتھ دیا۔ اُس نے شاہ کے متعلق ایک دفعہ گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"جب ہم ابن سعود کے جھنڈے تلے ـــــ وہ جھنڈا جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ شریف حسین کی مخالفت میں آگے بڑھ رہے تھے تو ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ابن سعود وہ موسیٰ ہے جو ہمیں جہالت اور تباہی کی تاریک وادیوں سے نکال کر اسلام کی آزاد اور امن پسندانہ سرزمین میں لے جائے گا۔ لیکن اُس نے جب آرام و آسائش میں کھو کر اپنی رعایا اور اُس کے مستقبل کو فراموش کر دیا تو پھر ہمارے نزدیک اُس کی حیثیت ایک فرعون کی سی تھی۔"

اُس کے اس تاثر پر اسد صاحب تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"میرے رفیق نے ابن سعود کے خلاف جس غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے اُس میں بڑی تلخی ہے

اور اس کی رائے غیر محتاط اور غیر منصفانہ ہے۔ شاہ نہ تو فرعون ہے اور نہ ہی ظالم۔ وہ ایک شفیق انسان ہے
اور اپنی رعایا سے محبت کرتا ہے۔ لیکن وہ موسیٰ بھی نہیں۔ اُس کی ناکامی کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ اُس ارفع
اور اعلیٰ معیار پر پہنچ نہ سکا جس پر لوگ اُسے دیکھنے کے آرزومند تھے . . . وہ زیادہ سے زیادہ ایک
وسیع پیمانے پر رحم دل قبائلی سردار ہے۔"

اس کے بعد فاضل مصنف نے ایران کے ذہنی پس منظر کا جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ یہاں شیعیت کو کیوں
زیادہ عروج ہوا۔ وہ فرماتے ہیں۔

"تقریباً ڈیڑھ سال جو میں ایران میں رہا میں نے محسوس کیا کہ اس ملک میں یاس و قنوطیت
پھیلی ہوئی ہے اور یہ چیز دیہات اور شہروں میں، لوگوں کے باہمی تعلقات میں، حتیٰ کہ اُن کے
مذہبی تہواروں میں --- الغرض ہر جگہ نمایاں ہے۔ ایرانیوں کے مذہبی احساسات میں عربوں کے برعکس
غم و افسوس کا عنصر غالب ہے۔ اُن کے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اُن کے نامور بیٹوں
حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی وفات پر آہ و فغاں کرنا اس سے کہیں زیادہ اہم ہے کہ وہ
دیکھیں کہ اسلام ہم سے کس چیز کا مطالبہ کرتا ہے اور ہمارے سیرت و کردار کو کس سانچے
میں ڈھالنا چاہتا ہے۔"

اسد صاحب نے دجال کے ذیل میں بحث کرتے ہوئے مغربی تہذیب پر بڑی سخت چوٹیں کی ہیں۔ یہ
ساری بحث بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس کے کچھ حصے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

"تہذیب جدید دجال کی طرح کانی اور یک رخی ہے۔ وہ صرف انسان کے ایک پہلو یعنی مادی
ترقی کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے روحانی پہلو کو بالکل نظر انداز کرتی ہے۔ اس نے اپنے صنعتی
کمالات کی وجہ سے انسانوں کو اُن کی طبعی استعداد سے کہیں زیادہ بڑھ کر دیکھنے اور سننے کے قابل
بنا دیا ہے، وہ اب زیادہ سے زیادہ فاصلے تھوڑے سے تھوڑے عرصے میں طے کر سکتے ہیں . . .
اس کی مادی ترقی نظر کو اس قدر خیرہ کرنے والی ہے کہ جن لوگوں کا ایمان کمزور ہے انھوں نے اسی کو
خدا تسلیم کر لیا ہے۔"

"انہیں اس امر کا پورا الیقین ہے کہ یہ تہذیب انہیں راحت اور حقیقت سے ہم کنار کردے گی اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انھوں نے دنیا کے اطراف و اکناف میں عیسائیت کو پھیلانے کے منصوبے بنائے لیکن اب اُن کا مذہبی جوش اور ولولہ اتنا سرد پڑ گیا ہے کہ اس کی حیثیت پس پردہ ساز کی سی ہے، جو ہمیشہ بجتا تو رہتا ہے لیکن ان کی زندگی کو متاثر نہیں کرتا۔ ان لوگوں نے اب زندگی کے مادی نظریہ کی اشاعت شروع کی ہے۔ اُن کا عقیدہ اب یہ ہے کہ دنیا کے سارے مسائل کارخانوں، تجربہ گاہوں، ماہرینِ شماریات کی میزوں پر حل کیے جا سکتے ہیں۔"

"مغربی انسان نے حقیقت میں دجال کی پرستش شروع کر دی ہے۔ عرصہ ہوا وہ شرافت کو چھوڑ بیٹھا ہے۔ اُس کا اب فطرت سے بھی تعلق باقی نہیں رہا۔ زندگی اس کے لیے ایک معمہ ہے۔ وہ شک کی بیماری میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے عزیز و اقارب حتیٰ کہ اپنے آپ سے بیگانہ ہے۔ اپنی اس تنہائی کو دُور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کو خارجی ذرائع سے مفتوح کرے۔ اُس کا محض زندہ رہنا اُسے اندرونی طور پر اطمینان اور تسکین عطا نہیں کر سکتا۔ چونکہ اُس کا اپنے خدا سے رشتہ منقطع ہو گیا ہے اس لیے اُس نے اپنی رفاقت کے لیے مشین کو منتخب کیا ہے وہ اب اپنی ساری توجہ اسی پر صرف کر رہا ہے لیکن اس نے اس کے لیے نئی ضروریات اور نئے خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔ مشین کا پہیہ اب اس کا خدا ہے۔ لیکن [illegible] ہٹ مذہب کے پروہت اور پادری غالباً اس حقیقت سے واقف نہیں کہ یہ حیرت انگیز صنعتی ترقی علم کے اضافہ اور وسعت کا نتیجہ نہیں بلکہ روحانی ناکامی اور مایوسی کا اثر ہے اور یہ [illegible]ت انگیز مادی کمالات جن کی موجودگی میں انسان یہ گمان کر بیٹھا ہے کہ وہ فطرت کو مسخر کرنے کا در حقیقت ایک [illegible] انداز فکر کے ترجمان ہیں . . . اس کے چمکتے ہوئے "ظاہر" کے پیچھے [illegible] کے وجود کا احساس انگڑائیاں لے رہا ہے۔"

کتاب کے مصنف بسا اوقات جذبات کی رو میں بہہ کر بڑے جوش سے سوالات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی پستی اور بدحالی پر سخت مضطرب اور پریشان ہیں۔ وہ اس بات پر حیران ہیں کہ [illegible]

قوم نے آخر اسلام ایسی متاعِ گراں مایہ کو کیوں چھوڑ دیا ہے۔ وہ جب اس موضوع پر آتے ہیں تو جھنجلا اٹھتے ہیں۔ اُن کی اس جھنجلاہٹ کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں۔

”اے مسلمانو! آخر اس کا سبب کیا ہے کہ تمہارا اپنے آپ سے اعتماد اٹھ گیا ہے، وہ اعتقاد جس کی مدد سے تم نے کبھی عرب سے مغرب کی طرف بحرِ اوقیانوس تک اور مشرق میں چین تک کا علاقہ ایک صدی کے اندر اندر ہی فتح کر لیا۔ اور اب تم شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ مغربی رسم و رواج کو بڑی آسانی سے قبول کرتے جا رہے ہو۔ تم وہ لوگ ہو جن کے آبا و اجداد نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے، تہذیب کے گیسو سنوارے۔ تم کیوں اپنے درخشاں ماضی کی طرف نہیں پلٹتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ ادنیٰ سا فوجی اتاترک جو اسلام کی ساری اقدار کا انکار کرتا ہے وہ تمہارے لیے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا ایک نشان بن چکا ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ کس طرح تمہارے پیغمبر کی سادہ تعلیمات بے مقصد قیاس آرائیوں اور بحث و مناظرہ میں دب کر رہ گئی ہیں۔ تمہارے شہزادے اور تمہارے جاگیردار عیش و عشرت کی زندگی ان حالات میں بسر کر رہے ہیں جبکہ اُن کے لاتعداد بھائی انتہائی غربت اور افلاس میں مبتلا ہیں۔“

”تمہارے اسلام نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جس میں نہ تو نیشنلزم ہے اور نہ ہی طبقہ واریت۔ اس میں نہ تو کوئی چرچ ہے اور نہ ہی کوئی مذہبی گروہ۔ اس میں شرافت ایک نسل سے دوسری نسل سے منتقل نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک فرد کے اعمال پر موقوف ہے۔ اس تہذیب کا مقصد انسان اور خدا کے درمیان تھیا کریسی کا قیام تھا، اور انسانوں میں جمہوریت کا نشو و نما۔“

اسد صاحب کا جوش جب کچھ دیر کے بعد ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ پھر اسلام کے متعلق نہایت ہی صحیح نتیجے پر خود بخود پہنچ جاتے ہیں۔

”مسلم ممالک میں مسلمانوں کے جو حالات میں نے دیکھے، انھوں نے مجھے اسلام سے کسی طرح بھی بدظن نہ کیا۔ چار سال جو میں نے وہاں گزارے، اُن میں میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو گیا کہ اسلام اب بھی ایک زندہ و پائندہ قوت ہے۔ میرے لیے صرف اسی قدر جاننا باعثِ اطمینان تھا

(باقی صفحہ ۳۸ پر)